ڈاکٹر قاضی عبدالرحمٰن عابد / عمران اختر

سائنس اور ادب کے باہمی روابط واشتراکات

This article is basically concerned with the domain occurred between the entities of Literature and Science,which the land of commonalities in the both. The article addresses the issues and concerns which have an importance simultaneously in the both fields different apparently but very close to each other as far as the human life and its interests are concerned.The beginning of the essay exhibits the deep relation of the both Literature & Science with the light of Philosophy,as it is very rightly believed that each & every aspect and dimension of Knowledge has its roots inPhilosophy.Later, it is explored by the various examples from theoretical and implied realm of the history i.e.of Scientific development,of academic progress and of socio-political perspective.The article encircles almost the whole dimensions related with the common domains of interests among Literature & Science e.g.Mythology,Anthropology etc as the ancient times of Greek and Roman civilization is also recalled,while discussing the origin of this journey of enlightenment.I hope,it would be studied thoroughly and judged on the justified grounds.

سائنس حقیقت کے ادراک، عقلیت کی نفی، غیر جانبداری، تعصّبات شکنی، آفاقیت، انفرادیت، مطلق آزادی اور انسانی فلاح و بہبود کے بیشتر پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ سائنس چونکہ ایک آفاقی مذہبی عینیت کی حامل ہے لہذا پوری دُنیا نے بالخصوص اور اسلامی دُنیا نے بالعموم اسکے افادی پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے اس کو اپنی زندگیوں میں شامل کرنے پر متفقہ طور پر اتفاق کر لیا ہے، حالانکہ سائنس کو کلیسا اور مندر و مسجد نے کبھی بھی دل سے تسلیم نہیں کیا مگر اسکے باوجود عام بنی نوع انسان نے اپنی زندگیوں میں مثبت تبدیلیوں اور سہولتوں کے پیش نظر اس کے استعمال میں ہمیشہ سُرعت سے کام لیا ہے۔ سائنس میں تحقیق، تفکر، تجسس اور سماجی و معاشرتی ضروریات کلیدی حیثیت رکھتے ہیں تاہم زندگی میں درآنے والے واقعات و حادثات اور ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے سائنس نے ہمیشہ اپنا کردار ادا کیا لہذا اسی لیے ایسی سائنس کو صحت مند سائنس کے زمرے میں شامل کیا گیا مگر محض ضروریات زندگی کو پورا کرنے کی خواہش لیے ہوئے سائنسی طرز فکر اختیار کرنا کسی بھی صورت میں سائنس کو اہم مقام پر فائز نہیں کر سکتا کیونکہ سائنس بنیادی طور پر ہماری سماجی و معاشرتی زندگیوں میں خون کی طرح گردش

کر رہی ہے۔

سائنس ایک مربوط (Systematic) مکمل (Complete) اور درست واقفیت کا علم ہے جبکہ طبعی علوم یعنی (Natural Science) اشیاء کو جیسی کہ وہ ہیں اسی حالت میں بیان کرنے کا نام ہے۔ رابرٹ بریفالٹ کے مطابق ''سائنس سے مراد تحقیق کی نئی روح، تفتیش کے نئے طریقے اور پیمائش و مشاہدہ کے نئے اسلوب ہیں۔۔۔۔ جن سے لوگ بے خبر ہیں'' سائنس ارتقائی نقطہ نظر کا سہارا لیتے ہوئے حالات و واقعات کی سچی تصویر معاشرے کے سامنے پیش کرنے کا بنیادی فریضہ سرانجام دیتی ہے جبکہ سائنسی طرزِ فکر میں معروضی طریقہ کار کو اپنایا جاتا ہے اور یہ مشاہدہ obsorvation سے اپنے سفر کا آغاز کرتا ہے اور مشاہدہ کو مربوط انداز میں پیش کرنے کے لیے مفروضہ Hypothesis کو قائم کیا جاتا ہے پھر مفروضے کی جانچ کیلئے تجربات در تجربات یعنی Experiment کے ایک منظم نظام سے راستہ تلاش کیا جاتا ہے اور اگر تجربات مفروضہ کو درست انداز میں مثبت پیش رفت کے ضمن میں پیش کریں تو صرف ایک نظریہ یعنی Thcory کو قائم کر لیا جاتا ہے اور پھر نظریہ کے بعد پیشین گوئی یعنی Prediction کا مرحلہ آتا ہے، یہاں پر انسانی حواس خمسہ اور سائنسی طرزِ فکر معروضی سے موضوعی صورت اختیار کر لیتا ہے اگر پیشن گوئی منفی نتائج کی صورت میں سامنے آئے تو نظریے کی صداقت مشکوک ہو جاتی ہے جبکہ پیشین گوئی درست انداز میں واضح صورت اختیار کر لے تو پھر وہی پیشن گوئی Law یعنی قانون کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ سائنس کا مقصد کائنات کو طبعی قوانین کی روشنی میں دیکھنا اور طبعی و معاشرتی سائنسوں کا باہم اشتراک ہے جہاں انسانی زندگی کے مسائل، ان کا حل اور زندگی میں در آنے والے واقعات و حالات کا سائنسی طرزِ فکر کی روشنی میں درست اندازہ لگانا ہے۔

کائنات اور فکر کی تسخیر کا نام ادب ہے گویا ادب فکری جمود کو موضوعی صورت میں پیش کرنے کا ایک منظم طریقہ کار ہے جس کی مدد سے انسانی ذہن علم و ادراک کی وسعتوں کو کسی ایک نقطہ تک محدود نہیں کر پاتا بلکہ وہ پوری کائنات کو موضوع بنا کر مرکزی نقطہ فکر کے شعوری حوالوں کو پیش کرتا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے نزدیک:

> ''ادب کو تخلیق کا ماحصل مان کر اتنا تو بحر حال ماننا پڑے گا کہ ادب اپنی کلیت و ماہیت میں علم و فکر یا فلسفہ منطق کا اسیر و حلیف نہیں بلکہ ایک حد تک ان کا نقیض و حریف ہے علم کی صورت یہ ہے کہ وہ فرد کے ذاتی میلانات یا جذبات کو مَس کرتے ہوئے گزرے تو نامعتبر ٹھہرے گا اس لیے محض علم کی بنیاد پر ادب کے بارے میں کوئی حکم لگانا مناسب نہ ہوگا'' (۱)

ادب تاریخی شعور اور سائنسی طرزِ فکر کے دباؤ سے آزاد ہو کر تخلیقی عمل کے بیان کرنے کا نام ہے۔ نظریات تین قسم کے ہوتے ہیں، رُومانی، عملی اور فکری۔ ادب ان تینوں نظریات کو بیک وقت استعمال کرتے ہوئے ادیب کے لئے فکری راہ کا تعین کرتا ہے جب ہم ادب کی آنکھ سے تمثال یعنی Images کا مشاہدہ کرتے ہیں تو اس سے متعلق ذہن کی آنکھ بیدار ہوتی ہے اور ان تمثال کی روشنی میں مکمل تصویر کو فکر کے کینوس پر اتار دیتی ہے، خیالات و تصورات ایسے جامد پن کا شکار نہیں کہ شعور کی دنیا میں اچانک سے دَر آئیں اور پھر ہمیشہ کیلئے عکس چھوڑ کر لاشعور میں کہیں کھو جائیں بلکہ یہ تو حالات و واقعات کا ایسا امتزاج ہوتے ہیں جو خیالات کو مخرج کے طور پر پیش کرنے اور ان کو ذہنی اور فکری تمثال Images کے ساتھ مربوط کرنے کا سارا عمل سرانجام دیتے ہیں۔

سائنس اور ادب کے باہمی اشتراکات زندگی میں در آنے والے واقعات کو فکری آسودگی بہم پہنچانے کا سبب بنتے ہیں جس طرح سائنسی فکر میں Dogmatic یعنی ضابطہ عقائد اور جامد پن خود اپنے ہی وجود سے عاری ہوتے ہیں، اسی طرح ادب میں بھی کسی ایک خاص پیمانے کو معیار نہیں بنایا جا سکتا۔ سائنس نے جس طرح سماج کی ہیت ترکیبی کو بدل کر رکھ دیا ہے

بالکل اسی طرح ادب ہم عصر زندگی کے مسائل کے حل اور ادراک کی دنیا سے کہیں آگے نکل گیا ہے۔ جہاں سائنس فکری بے راہ روی کو انسانیت کے Destruction یعنی تباہی کا ذمہ دار سمجھتی ہے وہیں منفی ادب بھی انسانوں کے لہو میں (Posions) زہریلی آمیزش کو مہلک گردانتا ہے۔ ادب بھی سماجی تغیرات کے ساتھ ساتھ اپنی فکری رجحانات کو جدیدیت سے ہم آہنگ کرتا چلا جارہا ہے گویا اگر سائنس کو جسم مان لیا جائے تو ادب کو روح تسلیم کرنا پڑے گا یا اس کے برعکس بھی۔

تغیر ادب اور سائنس دونوں کے لیے عصری حیثیت کا درجہ رکھتا ہے۔ معاشرتی تبدیلیاں ادبی ماحول میں تہذیبی آمیزش پیدا کرنے کا باعث بنتی ہیں جبکہ سائنسی طرزِ فکر ٹیکنالوجی کی سیڑھی استعمال کر کے انسانی فکر کو آسائشوں سے آشنا کر دیتی ہے اور یوں فکر سائنس اور ادب کے بیچ کہیں گم ہو کر رہ جاتی ہے مگر وجدانی فکر کو ان دونوں کے بیچ سے گزرنے کا بہترین سنگِ میل کہا جاسکتا ہے جبکہ ادب ان دونوں کے مرکز سے گزر کر شعور و آگہی اور ادارک کا دوسرا نام ہے۔ ادب ہمارے سائنسی انداز فکر کو کیسے متاثر کرتا ہے یا سائنس ہمارے ادبی میلانات میں کیسے دخیل ہے؟ اس بات کو فہم و ادارک اور شعوری کوششوں سے سمجھنے کی ضرورت ہے، جب ہم آکسیجن کے بغیر سانس لینے کا عمل مکمل نہیں کر سکتے تو پھر زندگی میں سائنس کے نہ ہونے کا جواز کیسے پیش کیا جاسکتا ہے؟ ہر ادب اپنے فکری جمود سے آزادی چاہتا ہے اور یہ آزادی اس کو زندگی کے مسائل کے حل اور اس کو منطقی انداز میں سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ جبلت اور جذبات کی نفسیات ہمارے ادب کو ہر لحظہ متاثر کر رہی ہے۔ انسانی امور میں ادب کے مقام و مرتبہ کو جاننے کیلئے تجربے کے عمومی ڈھانچے کا ادارک ضروری ہے۔

فکر، وجدان سے شعوری بالیدگی حاصل کرتی ہے اور سماجی تغیرات اس کے ارتقاء کی منازل طے کرنے میں اس کی مدد کرتے ہیں، ادراک کی بدولت فکر میں گہرائی، وسعت اور فکری منہاج متعین ہوتی ہیں اور یوں انسانی فکر کا عمل بھی سائنسی طرز فکر کی طرح دو طریقے کار اختیار کرتا ہے۔ استخراجی (Deductive) جو کل سے جزو یعنی (Whole to Part) کی جانب سفر کا آغاز کرتا ہے جبکہ دوسرا استقرائی طرز فکر ہے جو جُز سے کُل کی سمت فکری کاوشوں کو متعین کرتا دیکھائی دیتا ہے، اس Indeductive طرزِ فکر میں اساس بھی سائنسی طرزِ فکر کی طرح تجربے اور مشاہدے کو ہی حاصل ہوتی ہے۔ سائنس و ادب فلسفیانہ نقطۂ نظر میں زیست سے متعلق آگہی اور تہذیب نفس و شعور کی جانب پیش قدمی کے بہترین ذرائع ہیں۔ سائنس کے ضمن میں فلسفیانہ مباحث نے عام انسان کی زندگی کو بھی بہت حد تک متاثر کیا اور سائنسی انکشافات سے متعلق حقائق کو اپنی فکر میں شامل کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

تاریخی تناظر میں سائنس اور ادب کے متوازی ارتقاء، عہد بہ عہد سائنسی ترقی اور ادبی رجحانات کے عوامل جاننے کے لیے تہذیبی تغیرات کے مطالعے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ سپارٹا اور ایتھنز کی ابتدائی معاشرتی اور ادبی ضرورتوں کا تجزیہ کرنے کے بعد سوفسطائی فلسفہ علم و ادب کی ابتداء پانچویں صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہے۔ سوفسطائی اساتذہ کو یونانی زبان میں ''سوفسط'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ یونانی زبان کا یہ لفظ ''سونی وسوف'' سے ماخوذ ہے جس کے لغوی معنی متقی، پرہیزگار، پاکباز اور شریف النفس کے ہیں یعنی ان اساتذہ میں اخلاقی بلندی بدرجہ اتم موجود تھی اور یہ اساتذہ یا فلسفی زیادہ تر گشت کرتے ہوئے اپنے تعلیم کو دوسروں تک پہنچاتے تھے اور اس طرح آزاد خیالی کا آغاز ہوا اور عقائد و روایت پرستی سے ہٹ کر قوانین قدرت اور حقیقت کی جانب رسائی کا سلسلہ شروع ہوا، دراصل یہیں سے سائنس کی ابتداء ہوتی ہے اور یوں علم و ادب کا باقاعدہ آغاز نظر آتا ہے جو سوفسطائی طبقہ وجود میں آیا وہ دراصل ''گشتی'' کہلائے کیونکہ یہ لوگ بازاروں اور شہروں میں جا کر اپنی تعلیمات لوگوں تک پہنچاتے تھے اور مقامی مسائل پر گفتگو کرتے اور ان کا باقاعدہ حل پیش کیا جاتا تھا، جس کی بدولت لوگوں میں مشاہدہ اور غور و فکر کا عنصر پیدا ہوا لیکن ایتھنز کا قدامت پسند طبقہ اس آزاد خیالی کو پسند نہیں کرتا تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ سوفسطائی طبقہ معاشرہ میں گمراہ کن خیالات کو ہوا دے رہا ہے۔ الغرض سوفسطائی طبقہ فکر کے یہ مصلحین بدنام

ہونے لگے ،مشہور ر یونانی مفکر سقراط کا تعلق بھی اس گروہ سے تھا۔ جس پر حکومت ایتھنز نے مذہب کے خلاف جذبات بھڑکانے کے الزام میں مقدمہ بھی چلایا اور یوں اس مقدمے کے فیصلے کے ضمن میں سقراط کو سزائے موت دی گئی۔ سقراط کے ہاں دو قسم کے علوم کا تذکرہ ملتا ہے، علم حقیقی اور علم غیر حقیقی۔ سقراط کا طریقہ تدریس استدلالی تھا اس نے باقاعدہ کوئی کتاب نہیں لکھی مگر افلاطون کی کتاب ''جمہوریہ Republic'' میں اس کا بار بار تذکرہ اس کی توقیع واہمیت کا بیّن ثبوت فراہم کرتا ہے۔" مکالمات" سے اس کی علمی وفکری تعلیمات کی نوعیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، حالانکہ سقراط کی ذاتی باقاعدہ کوئی تحریر نہیں ملتی جس سے اس کے حالات زندگی کا اندازہ لگایا جاسکے مگر اس کے شاگرد افلاطون کی تحریروں، تصانیف اور مکالموں میں سقراط کی علمی بحثوں کے تذکرے سامنے آتے ہیں جس سے اس کے حالاتِ زندگی اور طرزِ تعلیم وفلسفانہ افکار کا پتہ چلتا ہے۔

یونان کے عظیم مفکر سقراط [☆] انے جہاں سائنس وفلسفہ کو وجودیت عطا کی ہے وہیں ادب کے ذریعے اپنی ریاستوں میں زندگی کی پیچیدگیوں کو دور کرنے کیلئے کلیسا کے راستے پر چلنے کے لیے راہ کو بھی ہموار کیا۔ جب ہم یونان کی دو عظیم شہری ریاستوں ایتھنز اور سپارٹا کے نظام معاشرت کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہاں بھی تصور کائنات ہی معاشرتی اقدار کو مثبت فکری رجحان عطا کرتا ہے جبکہ سیاسی اور معاشرتی سرگرمیوں میں تبلیغ اور فکر کی اشاعت کیلئے سماجی، معاشرتی ادبی اور تہذیب یافتہ زبان کا استعمال نظر آتا ہے گویا ادب کی جڑیں ان کے فکری جمود کو سبوتاژ کرنے کیلئے وہاں بھی نئی اقدار متعین کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس ابتدائی یونانی تہذیب ومعاشرت میں ارسطو کے خیالات بھی فلسفیانہ فکر کے حامل لوگوں کیلئے کسی کوہ گراں سے کم نہ تھے۔ یونانی تصورِ کائنات علوم عقلیہ کی تحصیل پر زور دیتا ہے اور اسی معاشرے میں مذہب (Religion) میں دیوتاؤں کی کثرت کا بیان اپنا ایک اہم مقام رکھتا ہے ان دیوتاؤں میں Zeus کو برتری اور تمام پر فوقیت حاصل ہے۔ یونانیوں کے نزدیک Zeus تخلیقی صلاحیتوں سے محروم ہوتا ہے مگر اپنے تمام دیوتاؤں سے اولیت کی بنیاد پر وہ سب پر سبقت رکھتا ہے اور تمام تر دیوتا اس کے حکم کے محتاج ہیں مگر ان میں اقتدار کی جنگ اور باہمی احکامات کے حوالے سے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہونے کی وجہ سے جنگ وجدل کا بازار گرم رہتا ہے الغرض یونانی عقیدے میں ذاتی عقائد بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔

> ''درحقیقت Reduction نظریہ تقلیل یونانی تصور کائنات اور یونانی تمدن کی اصل بنیاد تھا مثال کے طور پر بابائے فلسفہ سقراط کا یہ خیال تھا کہ انسانی روح کے تین اجزاء ہیں۔ عقلی، جذباتی اور اکتسابی۔ صالح روح میں ان تینوں اجزاء میں مکمل ہم آہنگی ہوتی ہے اور ہر جزو دوسرے جزو سے تعاون کرتا ہے، عقل سربلند مقام پر فائز ہونے کے باعث جذبات کی نگرانی کرتی ہے۔ جذبات کی مدد سے وہ تمام افعال واعمال وقوع پذیر ہوتے ہیں جن کا عقل حکم دیتی ہے اور ان اجزاء میں اشتراک عمل کے فقدان کے باعث روح مریض ہوتی ہے''۔(۲)

سقراط کے بعد افلاطون کے تعلیمی اور ادبی نظریات ہمارے سامنے آتے ہیں اس کے فلسفہ کو سمجھنے کیلئے ''فلسفہ تصور'' کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ''حقیقت کو تصور کی مدد سے معلوم کیا جاسکتا ہے جبکہ حواس خمسہ صرف مادی علوم کا ذریعہ ہیں''۔ افلاطون ان لوگوں کو ہی فلاسفر گردانتا ہے جو عقل وادراک کو تصور کی آنکھ سے دیکھنے کے قائل ہیں۔ افلاطون کی کتاب ''جمہوریت'' میں مکالموں کا مرکزی کردار سقراط ہی ہے۔

ارسطو تعلیم میں روایت کی بجائے درایت کا قائل تھا اس نے سائنسی فکر کے حوالے سے مشاہدات، تجربات اور معقولات کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ زور استدلال پر دیا اور وہ عقل کو جذبات سے برتری پر رکھتا ہے۔ ارسطو استقرائی طریقہ پر توجہ مرکوز رکھتا تھا۔ سائنسی علوم کے ساتھ ساتھ وہ روحانی، اخلاقی اور ادبی علوم کو بھی زندگی کیلئے ضروری سمجھتا تھا اس سلسلے میں ارسطو کا یہ نظریہ اسکی سماجی اور معاشرتی پس منظر کو بخوبی بیان کرتا نظر آتا ہے۔

''ارسطو کا یہ نظریہ کے علوم عقلیہ کی عِلّت اولیٰ لازمی ہے چوتھی صدی قبل مسیح کے Pyrrhon of Elin جیسے مُتشکک فلسفیوں کو قابل قبول نہ تھا۔ان فلسفیوں کے ہاں مرکزی نقطہ تشکیک ہے Pyrrhon کے شاگرد Timon نے منطقیوں کے استخراجات کے بنیادی مقدمات صحیح نہ ہونے پر سخت گرفت کی۔Empiricus نے نظریہ قیاس کو منطقی اور بے بنیاد بتاتے ہوئے مسترد کیا ان کا کہنا تھا کہ منطقیوں کے ہاں مقدمات ہی کی بنا پر نتائج کو فرض کر لیا جاتا ہے۔انہوں نے نظریہ علیّت کو بھی اس لیے رد کیا کہ بیک وقت وقوع پذیر ہونے والے واقعات میں تو کوئی ربط تلاش کیا جا سکتا ہے لیکن اسباب معلول سے قبل واقع ہوتے ہیں۔ان کے بقول نظریہ علیّت ذہن کی اختراع محض ہے۔'' (۳)

یونان کا عہد اول ادب (۲۵۰۰ق۔م) سے شروع ہو کر ہومر کے دور تک پھیلا ہوا ہے جو (Myth) کے دلچسپ اور حیرت انگیز دیومالائی قصوں اور دیوی دیوتاؤں کی پرستش اور رسومات وعقائد پر محیط ہے جبکہ اس ضمن ''ایلیلڈ اور اڈیسی'' یونانی ادبیات خاص طور پر اپنا ایک علیحدہ مقام رکھتی ہیں۔بیسویں صدی کے مورخین کے نزدیک چھٹی صدی قبل مسیح کا یونانی ادب تاریخی حیثیت کا حامل ہے اور یہی وہ دور تھا جس میں ہومر اور ہسیڈ Hesiod کا فلسفۂ حیات خاص طور پر اہمیت کا حامل ہے۔Hesiod ہسیڈ کہتا ہے کہ'' کائنات قدرتی ہے اور اس کو عقلی اُصولوں سے سمجھا جا سکتا ہے''۔واضح باد کہ:

''برٹرینڈ رسل نے لکھا ہے کہ استخرابی طریقہ کار دو ہزار برسوں تک انسانی ذہن پر چھایا رہا، راجر بیکن نے استقرائی طریق فکر کو آگے لانے کی کوشش کی لیکن اس کی نگارشات توجہ کا مرکز نہ بن سکیں لگ بھگ تین صدیوں کے بعد یورپ کے نشاۃ ثانیہ کے آغاز پر فرانسس بیکن نے راجر بیکن کے استقرائی طریق فکر کو آگے بڑھایا اور یوں جدید سائنس اور اس کے اندازِ فکر کی بنیادیں استوار کیں۔جدیدیت کا تانا بانا سائنسی منہاج اور اس کے حاصلات سے ہی عبارت ہے'' (۴)

جبکہ اس کے برعکس چینی طرزِ فکر اور طریقہ علم زیادہ تر نامیاتی وجود کا قائل ہے اور چینی معاشرتی ضرورت کے حوالے سے سائنس وٹیکنالوجی کو بطور تجربہ کی حد تک دیکھتے ہیں اور چینیوں کی زیادہ تر سائنس معروضی طریقہ کار پر مشتمل دکھائی دیتی ہے جبکہ یونانی طرزِ فکر، منطق اور نظریہ تقلیل کو بنیاد سمجھتے ہیں۔اسی طرح فیثا غورث کائنات کو ریاضیات کی آساس تصور کرتے ہیں جبکہ ارسطو کائنات کو ریاضی کی تجریدی شکل گردانتے ہیں بحرحال کائنات کا پورا وجود ایک انتہائی پیچیدہ اور خود مکتفی نظام کی اساس ہے اور اس اساس کی بنیادی وجہ وہ سائنسی طرزِ فکر ہے جو سائنسدانوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔

چینی تمدن حیات یونانی تمدن سے یکسر مختلف ہے چونکہ یہ تمدن سائنس کو بہت دیر سے قبول کرتا ہے اس لئے اس نے ادب کا سہارا لیا ہے اور اس تناظر میں انسانی رشتوں اور اقدار کو متعین کیا گیا ہے۔ہر تمدن اپنے خدوخال کو واضح کرنے کیلئے ایک مخصوص تصور کائنات کا اعادہ کرتا ہے اس ضمن میں یہ بات نہایت اہم ہے کہ:

''چینی تصور کائنات کینفوشش Confucious کی تعلیمات سے ماخوذ ہے جس میں تقریباً ڈھائی ہزار سال تک کینفوشش کی تعلیمات کا دور دورہ رہا، ان کی تعلیمات کے زیرِ اثر چینی تمدن معرض وجود میں آیا'' (۵)

اہل یورپ میں علمی بیداری عرب سیاحوں کی مرہون منت ہے۔عربوں کی علمی وادبی زندگی کا آغاز طلوع اسلام سے ہوتا ہے جب چھٹی صدی کے آخر اور ساتویں صدی کی ابتداء میں اسلام عرب ریاستوں سے ہوتا ہوا افریقہ، چین، سپین اور ہندوستان تک جا پہنچا اور پھر یوں نویں اور دسویں صدی میں عرب لوگ اہل یونان کے علمی وادبی سرمایہ سے نبرد آزما ہوئے اور انہوں نے تمام تر یونانی علوم کا عربی میں ترجمہ کیا اور ان عربوں نے نہ صرف یونان بلکہ اہل روم وہند اور ایران میں بھی حصول علم کیلئے کوششوں کو تیز کر دیا اور علمی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا اس علمی وادبی تحریک کی رُو نے اہل یورپ کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔مشہور

مورخ ایچ جی گوڈ لکھتا ہے کہ

''مغربی ممالک میں ثقافت، تہذیب کی توسیع اور اشاعت میں عربوں کا مؤثر حصہ ہے''۔ (٦)

یورپ کی درسگاہوں میں عربوں کی ترجمہ کی ہوئی کتب سے چھ صدیوں تک استفادہ کیا جاتا رہا اور اسی طرح فرانس اور اٹلی کی درسگاہیں بھی عربوں کی تصانیف سے اپنی علم کی پیاس بجھاتی رہیں۔ مسلم تہذیب وتمدن کے عروج کا زمانہ سات سو سالوں پر محیط ہے جو ۷۰۰ء ق م سے ۱۵۰۰ء ق م تک پھیلا ہوا ہے، اس ضمن میں ۱۱۳۰ء طلبلطلہ میں مترجمین کا مدرسہ قائم کیا گیا جہاں عرب تصانیف کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا جاتا تھا الغرض یورپ میں بارہویں اور تیرہویں صدی میں یونانی اور لاطینی علوم سے استفادہ کا عمل شروع ہوتا ہے۔ یورپ اس زمانے کو Renaisance سے موسوم کرتا ہے یہی وہ زمانہ تھا جب اہل یورپ نے یونانی اور رومی تصانیف کا مطالعہ شروع کیا اور ان کے فکر وعمل میں ایک انقلاب برپا ہوا اور یہ انقلاب ان کی ذہنی بیداری، سائنسی زرخیری اور ادبی میلانات کا باعث بنا۔ یورپ میں چونکہ تمام علمی وادبی فکر پر کلیسا قابض تھا لہذا انہیں سائنسی طرزِ فکر اور ادبی شعور نے یکسر جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور وہ یہ بات سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ مذہبی آزادی کو شعور وآگہی صلّب کرتے جا رہے ہیں اور یوں کلیسا کی فوقیت علمی وادبی فضا میں کہیں دھندلا نہ جائے، اس خطرے کے پیش نظر انہوں نے سائنسی فکر اور فلسفیانہ سوچ سے آزادی ختم کرنے کیلئے تمام تر تعلیمی نظام اور فکری احیاء کو کلیسا کے ماتحت کر دیا اور یوں چودھویں اور پندرھویں صدی یورپ میں مذہبی واقتصادی تبدیلیوں کا پیش خیمہ بنی۔ یورپ کی تمام تر یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں کو پادریوں کے ماتحت کر دیا گیا اور کلیسا کے کے منشور کے خلاف بات کرنا تو درکنار سوچنے پر سخت سزا کا قانون بنالیا گیا۔ چھاپا خانہ کی ایجاد سے کلیسا کے اقتدار کا سورج ایک مرتبہ پھر ماند پڑتا نظر آرہا تھا اور یونان اور روما ادبی دنیا کے لیے ماڈل کی حیثیت رکھتے تھے اور انہی لوگوں کو خاص فوقیت دی جاتی تھی جو کلاسیکی ادب کے ماہر اور کلیسا سے جذباتی ہم آہنگی رکھتے تھے۔ مشہور مذہبی مصلح جان لوکان اور مارٹن لوتھر جیسے مذہبی اکابرین نے مذہبی اصلاح کیلئے تحریک کو جنم دیا اور یوں جرمنی، انگلینڈ اور فرانس میں بھی سائنسی طرزِ فکر رکھنے والے مفکرین نے سنجیدگی سے ادب اور ادب کی افادیت کے حوالے سے سوچنا شروع کیا اور وہ بیک وقت فلسفہ، منطق اور طبعیات کے ساتھ ساتھ ادب کی طرف راغب ہونا شروع ہوئے ان مفکروں میں جان ایموس کومنیٹس 1592ء کی کتاب ''The way of Light'' چین چیکوئس روسو کا ۱۷۱۲ء کی شہرہ آفاق تصنیف ''EMILE'' جو پانچ، جلدوں پر مشتمل ہے خصوصی مقام رکھتی ہے اس میں خود رومیو اپنے ابتدائی زندگی کے بارے میں یوں لکھتا ہے کہ

''اس نے چوری بھی کی، جھوٹ بھی بولا اور گندی حرکات کا مرتکب بھی ہوا، وہ ذہین اور کاہل تھا اس کا کوئی اصول نہ تھا کیونکہ اس کو بچپن میں صحیح تربیت نہیں ملی تھی''۔

عہد حاضر میں شواہد ونظائر اور ادب وسائنس کے انجذاب کو ظاہری صورت میں دیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں علوم کے متوازی ارتقاء کو سامنے رکھا جائے۔ تخیل اور تفکر کسی بھی سائنسی وادبی تخلیق کے لیے ذی روح کی حیثیت رکھتے ہیں، سائنس وٹیکنالوجی اور سوشل ونیچرل سائنسز انسانی شعور یا لاشعور کی تخلیق کاوشوں کے ہی مرہون منت ہیں اور فہم وادارک کسی بھی تخیل کو عملی صورت میں لاکر سائنسی ایجادات یا ادبی کاوش کے ضمن میں ہمارے سامنے بہترین صورت میں پیش کرنے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے، بنیادی طور پر محرک اور قوت متخیلہ کو جھجھوڑنے والی تحریک ہی دراصل فہم وادارک کی نئی نئی راہوں کو انسان کے لیے آئینہ کئے رکھتی ہے اور یوں سائنسی اور ادبی تخلیقات دراصل ایک دوسرے کی مخفی صلاحیتوں کو فکری اور شعوری سطح سے قریب تر کرنے اور نئی ایجادات اور ادبی شہ پارے وجود میں لانے کا باعث بنتی ہیں لہذا سائنسدان یا ادیب صرف خارجی نہیں بلکہ داخلی طور پر بھی جمالیاتی اظہار کے لیے اپنے آپ کو مجبور سمجھتا ہے۔ ادیب یا سائنسدان کسی بھی معاشرے کی بنیادی اکائی ہوتے ہیں اور یہ وہ حساس اور بے رحم طبقہ ہے جو اپنی قوت فکر اور معروضی نقطہ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے تلخ وشیریں حقائق کی

جانب ہماری توجہ مبذول کرواتا رہتا ہے جبکہ عام انسانی معاشرہ ایسی سوچ سے یکسر محروم دکھائی دیتا ہے، سائنسدان یا ادیب اپنی فہم وفکر اور شعور وآگہی کے سبب تمام تر موضوعی حوالوں کو مفروضوں، تجربوں اور نظریوں کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے ایسے معروضی حقائق پیش کرتے ہیں کہ جہاں ادب اور سائنس باہم مربوط اور منظّم صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ادب انسان کو انسان کے قریب جبکہ سائنس معاشرتی اور تہذیبی رشتوں کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج کو کم سے کم کرنے کیلئے اپنی کاوشوں کو بروئے کار لاتی ہے، اگرچہ سائنس وادب اور سائنسدان وادیب میں طریق کار، تخیل، فکر اور سماجی وتہذیبی عوامل باہم مربوط ہوتے ہیں تاہم وہ فکری وشعوری طور پر سائنسی طریقہ کار اور ادبی میلانات کو اپنے ادارک کے راستے میں حائل نہیں ہونے دیتے۔ ادیب خیال کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے کیونکہ خیالات کے تواتر کو وہ ابلاغ سمجھتا ہے جبکہ سائنسدان اور سائنسی طرزِ فکر رکھنے والے شخص کے لئے ''خیال'' سب سے اہم شے نہیں ہے، وہ خیال کو اہم سمجھتا ہے مگر ان خیالات کو جو اس کے مشاہدے، مفروضے، نظریے اور تجربات کی کسوٹی پر پورا اترتے ہیں گویا وہ عقل وادارک کو کبھی بھی جذبات کی آنکھ سے نہیں دیکھتا بلکہ جذبات وخیالات کو فکری سطح سے ہٹ کر معروضی سطح پر پرکھنے کی جانچ کرتا ہے مگر اصل کام روح اور جسم کا باہمی تعلق دکھانا نہیں بلکہ عملاً جسم میں روح پھونکنا ہے۔ جب ادیب یا سائنسدان کسی نظریے کو ادراک اور عمل کی کسوٹی پر اپنی فکر کے دائرے میں مربوط اور منظّم انداز میں پرکھ لیتا ہے تب جا کر وہ ''قانون'' بنتا ہے اور اس کی فکری اور شعوری جہتیں کھل کر سامنے آتی ہیں تو گویا اس مقام پر ہر ادیب ایک سائنسدان اور ہر سائنسدان ایک ادیب کا روپ دھار لیتا ہے۔

"Poetry elightens us in different way from science; it speaks directly to our feelings or imagination.The findings are no more and no less frece then science.[۷]

اس اقتباس میں سائنس وادب میں موجود دائمی رشتہ اور زیادہ نکھر کر سامنے آتا دکھائی دیتا ہے کہ

''نیچرل سائنسز، سوشل سائنسز، ٹیکنکل سائنسز، انسانی شعور، لاشعور اور تحت شعور کسی نہ کسی سائنس کے زیرِ اثر ضرور ہے۔ تخیل کو کسی بھی تخلیق ومشاہدے اور پرکھ میں بنیادی حیثیت حاصل ہے، بنیادی فکر اور ادارک وفہم اس قوت تخیلہ میں جان ڈالتے ہیں اور کسی سائنسدان اور شاعر کو تجربے اور مشاہدے سے گزر کر اصول و قوانین اور ادب میں نئی تخلیقات کے فکری اور سائنسی انداز سے وجود میں آنے کا سبب بنتے ہیں''۔ (۸)

ادب اور سائنس اپنے تہذیبی وثقافتی ورثے کے ساتھ ساتھ حال اور مستقبل کے ساتھ بھی مربوط اور منظّم رشتہ استوار رکھتی ہے اور سائنسی فکر وادبی شعور کسی بھی معاشرے کو بے یقینی کی کیفیت سے نکالنے اور جمود سے آزاد کرنے کا بہترین ذریعہ ہے یہ اقتباس اس ضمن میں اہمیت کا حامل ہے کہ

''ہر عہد اور سماج کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ تہذیب وروایات اور پسند وناپسند کے معیار ہوتے ہیں جو قوموں کے مزاج کی تشکیل کے اہم عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں اور انہی کا اظہار ادب میں بھی ہوتا ہے''۔ (۹)

اگر سائنس وآرٹس یا ادب عملی فنون ہیں تو پھر ادیب سائنسدان کیوں نہیں ہوسکتا؟ خیالات جب فکری سطح سے بلند ہوکر سائنسی فکر کے تابع ہوتے ہیں تو سائنسی طریقہ کار ایک شخص کو سائنسدان اور جب یہی خیالات ادراک کی جہتوں سے گزر کر عملی صورت میں اظہار پاتے ہیں تو ادب تخلیق ہوتا ہے اور یوں ایک شخص سائنسدان ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب کی صف میں بھی آن کھڑا ہوتا ہے۔ نظریات کا مطالعہ انسان میں ایسا شعور پیدا کرتا ہے جو اس کو زندگی سے آگہی کے ساتھ ساتھ عمل کے راستے کا تعین کرتے ہیں مدد دیتا ہے۔ نظریات کبھی ایک جیسے نہیں ہوتے بلکہ اپنے عہد اور تمدن کے آئینہ دار ہوتے ہیں تو گویا سائنسی فکر کے حامل تصورات رکھنے والا ہر شخص ادبی شعور کا حامل ہوسکتا ہے اور وہ ادب اور سائنس دونوں میں کائنات کے

قدرتی حسن اور رنگا رنگی کو اصل طریقے سے دیکھ سکتا ہے۔

''ہم سائنسی دور میں جی رہے ہیں جس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ہم سائنسی طرزِ فکر اختیار کریں اور اضطراری یا جذباتی فیصلے کرنے کی بجائے مسائل کا معروضی تجزیہ کریں، سائنسی اصولوں کی روشنی میں اُن کا حل سوچیں اور ماہرین کی رائے پر عمل کریں''۔ (۱۰)

سائنس کی اس انتہائی ضرورت کے ساتھ ساتھ سائنسی فکر کا حامل ہر شخص ادب کو کسی بھی طرح سائنس سے جدا نہیں گردانتا بلکہ اردو ادب بلا شبہ جغرافیائی حدود و قیود سے بہت آگے کی جانب اپنے سفر کے اشارے بہم پہنچا رہا ہے اور دوسری زبانوں کے اصنافِ ادب و سائنس کو اردو میں ڈھالا جا رہا ہے تا کہ زیادہ سے زیادہ سائنسی شعور اور ادبی ذوق کو یک رنگی کیفیت سے مزین کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ بہت سی اردو اصناف ادب اور سائنسی انکشافات کو دیگر عالمی زبانوں میں تراجم کے ضمن میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اس ضمن میں یہ اداریہ خاصی توجہ کا مستحق ہے کہ

''ہمارا یہ احساس اس حقیقت کے پیشِ نظر اور بھی تقویت حاصل کر رہا ہے کہ مغرب جس کی زبان ہی نہیں بلکہ تہذیب و معاشرت بھی جنوبی ایشیاء پر اپنا مکمل تسلط جما چکے تھے اور جن کی گرفت سے ہماری حیات اجتماعی کے مظاہر بلکہ اذہان تک آج بھی آزاد نہیں ہو سکے ہیں، خود اردو زبان و ادب کی سحر انگیز افادیت کے زیرِ اثر آتا جا رہا ہے، اس کا سہرا بالخصوص جنوبی ایشیاء سے نقل مکانی کر کے مغرب کی طرف جانے والوں کے سر ہے جن میں پاکستانی تارکین وطن زیادہ سرگرم و متحرک نظر آتے ہیں''۔ (۱۱)

ادیب یا سائنسدان ایک ایسے معاشرے میں سانس لے رہے ہیں جہاں تفکر مشاہدہ تجربہ اور تخیل ہر ممکن صورت میں ہر زی روح کو متاثر کرتا ہوا دیکھائی دیتا ہے۔ فطرت کا مطالعہ چاہے وہ ادب کی آنکھ سے ہو یا سائنسدان کی سائنسی فکر کے سائے میں بہر حال یقینی صورت میں اپنا مثبت تاثر اور حقیقی نقش پورے تہذیبی و معاشرتی فضاء پر مسلط کرتا ہے جہاں سائنس انسانی فکر، رویے اور سوچ کو متاثر کرتی ہے وہیں ادبی فضا انسان کے سانس لینے کا سامان پیدا کرتی دکھائی دیتی ہے۔ انسانی فطرت ایسی قوت مُتخیلہ کے زیرِ اثر ہے جہاں سائنسی فکر اور فہم و ادارک ادبی رشتوں میں باہم جڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور شاید اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ

''آج ضرورت ایسے نقاد کی ہے جو Big Bang سے نیا جہانِ نقد وجود میں لائے اسے ''حالی'' قرار دیا جا سکتا ہے مگر ایسا ''حالی'' جو حال کی بجائے مستقبل میں ظہور پائے گا''۔ (۱۲)

اس اقتباس پر غور کیجئے کہ

''تجربہ، جذبات اور رجحانات سے بنتا ہے جذبات ہی وہ محرک ہیں جو جسمانی تبدیلیوں میں بازگشت کے ساتھ ردِعمل کے طور پر پیدا ہوتے ہیں جبکہ رجحانات و محرکات ہیں جو ایک قسم یا دوسرے قسم کے طرزِ عمل کے جواب یا ردِعمل کی مدد سے پیدا ہوتے ہیں''۔ (۱۳)

ہر ادیب اور سائنسدان کی ذہنی سطح اپنے اپنے فکری ماحول میں پروان چڑھتی ہے ہم میں سے اکثر لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہیجانات اور امتیاز ازی کیفیات کے سوا کیا سائنسی تصورِ کائنات کا انسانی جذبات سے کوئی سنگم ہے؟ جذبات ہر ذی شعور شخص کی زندگی میں بنیادی محرکات کا درجہ رکھتے ہیں حالانکہ انسان خود آگاہی اور تفکر پسندی کی جبلت لیے اس دنیا میں آیا ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ (Inquestive) یعنی پُرتجسس ہے۔ احساسات، رویے اور زندگی میں در آنے والے واقعات انسانی شعور کو متاثر کرتے ہیں ہماری معاشرتی ضروریات بسا اوقات ہماری فکر پر حاوی ہو جاتی ہیں تو چاہے ادیب ہو یا سائنسدان وہ اس فکری خلفشار میں ادب یا سائنس کے میدان میں اپنی فکر کے دائمی اظہار و ابلاغ میں پریشان نظر آتا ہے مگر

ساتھ ہی ساتھ اس کی فکر وادراک کے دھارے ایسی کشمکش میں اس کے لیے فکر کے نئے راستے کھولنے کا باعث بنتے ہیں۔ سائنٹیفک اور جذباتی بیان وعمل میں تفاوت ہوتا ہے سائنس ''سچائی'' کو تجربہ گاہ میں جانچنا چاہتی ہے جبکہ ادب اس کو رویوں اور افکار کی روشنی میں دیکھنے کا خواہاں ہوتا ہے۔ فرضی اور خیالی دنیا میں تخیل خود آپ اپنی دنیا پیدا کرتا ہے غیر حقیقی باتیں (Fiction) ادیب اور سائنسدان کی فکری رویوں میں تبدیلی کا پیش خمیہ ہوتی ہیں۔ ''سچائی'' اور ''سائنسی سچائی'' دونوں میں خاصا فرق ہے مگر دونوں اپنے اپنے افکار ونظریات کے ضمن میں درست معنی رکھتے ہیں۔ رویے اور عوامل ادیب اور سائنسدان دونوں کو اپنے اپنے فکری اور منطقی رشتے میں باندھے ہوئے ہیں۔

> ''یہ ضروری ہے کہ بیماری کی صحیح تشخیص ہو، عام طور پر سائنس کی نام نہاد ''مادیت'' کو الزام دیا جاتا ہے یہ غلطی ایک حد تک بھونڈی بے ہنگم فکر کی وجہ سے ہے لیکن خاص طور پر جادوئی نظریے کی یادگاروں میں سے ایک ہے کیونکہ اگر کائنات کو پورے طور پر ''رومانی'' سمجھا جائے تو یہ بات اسے انسانی رویوں کے مطابق نہیں بناتی ، یہ نہیں کہ کائنات کن چیزوں کا مرکب ہے بلکہ یہ وہ کیسے کام کرتی ہے؟ وہ کونسا قانون ہے جس کی وہ پابندی کرتی ہے؟ یہ چیزیں جو علم کو ہمارے جذبات ابھارنے سے قاصر کر دیتی ہیں اور پھر بذات خود علم کی نوعیت بھی اسے ناکافی بنا دیتی ہے''۔(۱۴)

موجودہ صدی میں (Dialectics) جدلیات اور Noumena نے انسان کو سائنسی فکر اور استقرائی طریق پر سوچنے پر مجبور کر دیا ہے اور مادیت کے ائتلاف نے انسان کو داخلی ارتقاء کی جانب پیش قدمی کرنے اور Self Auenation یعنی اپنی ذات سے بیگانگی کے بھنور سے نکالنے کی راہ کو ہموار کر دیا ہے۔ ادب اور سائنس زندگی کا ایسا حسین امتزاج ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں کہ جس کی وجہ سے ہمیں اپنی زندگی کی تمام تر مشکلات کو اپنے فکر اور فہم وادارک سے حل کرنے کا موقع فراہم ہوتا ہے۔ مادیت زندگی گزارنے کیلئے ہمارے اندازِ فکر کو مادی حوالوں سے پرکھنے کا نام ہے جبکہ مادیت پسندی جس کو بورژوا طبقہ فکر نے معیوب شکل دے رکھی ہے حالانکہ اس مادیت پسندی میں فلسفیانہ اور عملی پہلو دونوں ہمیں حقیقت پسندی کی جانب لے جاتے ہیں جہاں پر انسان حقیقت کی آنکھ سے تصویر کے دونوں پہلوؤں پر غور وفکر کرتا ہے گویا ادب اور سائنس ہمارے فکری کینوس پر ایک مکمل تصویر مکمل سچائی کے ساتھ پیش کرنے کا نام ہے۔ جیسے جیسے جدید علوم کی جانب ارتقاء کا عمل وقوع پذیر ہو رہا ہے ویسے ویسے ادب اور سائنس اپنے اپنے فکری میلان میں وسعت پیدا کرتے جا رہے ہیں۔ سائنسی طرزِ فکر ایک انسان اور معاشرے کو **illusion** یعنی سراب سے نکال کر متحارب اور مستحکم قوت عطا کرتی ہے اور یوں مادی جدلیات اور انسانی فکر وادارک اور معاشرہ کے لئے نمو پذیری کے اسباب پیدا کرتی ہے، تصور کائنات ایک بنیادی اکائی کی حیثیت رکھتا ہے اور تمام تر کائنات عقل وجدان اور تخیل سے تخلیقی عمل کے کٹھن مرحلے سے گزرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ سائنس میں حواس فکر کے دائرے کو زندگی عطا کرتے ہیں تاہم تخلیقی عمل چاہے ایک ادیب کی فکر کا عکاس ہو یا سائنسدان کی، مترادف سمتوں میں سفر کرتا دکھائی دیتا ہے اس ضمن میں اقتباس ادیب اور سائنسدان کو معاشرتی مسائل اور حوالوں کے ضمن میں سوچنے پر مجبور کرتا دکھائی دیتا ہے۔

> "The Enlightenment a period in the eighteenth century when many writers and scientist's believed that science and knowledge,not religion, could improve peoples [۱۵]

سائنسی طرزِ فکر نے فلسفہ کی افادیت کو کم کرنے کی بہت کوشش کی مگر کوئی بھی علم اپنے افادی پہلوؤں پر ہی کھڑا ہوتا ہے سگمنڈ فرائیڈ نے علم نفسیات اور سائنسی فکر وفلسفہ کو ہم معنی قرار دیا ہے جدید فلسفہ نے فلسفہ قدیم کے افاقی پہلوؤں کو نئے

اسلوب و معنی عطا کیے۔ آئن سٹائن اور گلیلیو سرفہرست ہیں، گلیلیو نے سائنسی فکر و شعور کی بناء پر نظام شمسی سے متعلق قدیم فلسفیانہ فکر کے تمام بُرج الٹ کر رکھ دیئے اور بطلمیوسی عقائد کا خاتمہ کر دیا۔ قدیم یونانی فلسفے کے افادی پہلوؤں میں ٹھوس ثبوت یہ ہے کہ اس فلسفہ نے تمام قدیم مذاہب کو فکری ہم آہنگی کا راستہ دکھایا ہے، سوفسطائی طبقہ فکر کے معلمین کے بارے میں پانچویں صدی میں تحریک عقلیت یونانی فکر و فلسفۂ قدیم کو بہترین صورت میں ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ الغرض ادب اور سائنس تاریخی و تہذیبی تناظرات، روابط اور اشتراکات کا ایک ایسا حسین امتزاج ہمارے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں جہاں جسم اور روح باہم مربوط و منظّم دکھائی دیتے ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر ''ادب اور ادب کی افادیت''، اختر کتاب گھر کراچی، جولائی 1996ء، ص9۔

۲۔ ضیاءالدین سردار، ''اسلامی سائنس کیوں؟''، سنٹر فار سٹیڈیز ان سائنس، سول لائن، علی گڑھ، انڈیا، اشاعت دوم اپریل 1991، ص9۔

۳۔ ضیاءالدین سردار ''اسلامی سائنس کیوں؟'' سنٹر فار سٹڈیز ان سائنس، سول لائن، علی گڑھ، انڈیا، اشاعت دوم اپریل 1991، ص15۔

۴۔ ثاقب رزمی، سائنسی فکر اور ہمعصر زندگی ''نگارشات، ۳ ٹیمپل روڈ لاہور اشاعت اول ۱۹۸۸، ۸ص۷ پیش لفظ از قاضی جاوید۔

۵۔ ضیاءالدین سردار، ''اسلامی سائنس کیوں؟''، سنٹر فار سٹڈیز ان سائنس، اشاعت دوم 1991ء سول لائن علی گڑھ انڈیا، ص6۔

۶۔ رسول بخش سرانی، پروفیسر ''مغربی مفکرین تعلیم''، ص39۔

۷۔ بحوالہ انوار احمد، ڈاکٹر، خالد جاوید، ''پروین شاکر کی شاعری میں سائنسی شعور''، جرنل آف ریسرچ اردو فیکلٹی آف لنگویجز اینڈ اسلامک سٹڈیز اشاعت 2008، والیوم 14، ص164۔,

Oxford University Press Oxford, 1999,p.221.(Kemp, Peter; edited, "Literary Qutations"

۸۔ بحوالہ انوار احمد، ڈاکٹر، خالد جاوید، ''پروین شاکر کی شاعری میں سائنسی شعور''، جرنل آف ریسرچ اردو فیکلٹی آف لنگویجز اینڈ اسلامک سٹڈیز اشاعت 2008، والیوم 14، ص148۔

۹۔ روبینہ ترین، ڈاکٹر، ''اردو کی ابتدائی نثری تصنیف معراج العاشقین، تحقیق و تنقید کے آئینے میں'' ریسرچ جرنل فیکلٹی آف لینگویجز اینڈ اسلامک سٹڈیز بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان 2001، والیوم 1، ص102۔

۱۰۔ شان الحق حقی، ''سائنسی تعلیم اور لال بجھکڑ والی منطق''، اخبار اردو، شمارہ خصوصی اپریل 1990، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ص16۔

۱۱۔ اداریہ، سہ ماہی الاقرباء، اسلام آباد، جولائی تا ستمبر 2004، الاقرباء فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ص6

۱۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ''مشرق اور مغرب کے معیارات تنقید کا تصادم اور انجذاب''، جرنل آف ریسرچ، فیکلٹی آف

لینگویجز اینڈ اسلامک سٹڈیز بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان، اشاعت 2003، والیوم 4، ص 71۔

۱۳۔ آئی۔اے رچرڈسن، ''سائنس اور شاعری (1926)''، ارسطو نے ایلیٹ تک، طبع ہفتم اشاعت 2003، نیشنل بک فاؤنڈیشن کراچی، ص 436۔

۱۴۔ آئی۔اے رچرڈسن، ''سائنس اور شاعری (1926)''، ارسطو نے ایلیٹ تک، طبع ہفتم اشاعت 2003، نیشنل بک فاؤنڈیشن کراچی، ص 452۔

۱۵۔ ''اردو میں خرد افروزی کی فکری روایت'' حماد رسول، ریسرچ سکالر، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان، جنرل آف ریسرچ فیکلٹی آف لیگویجز اینڈ اسلامک سٹڈیز، سن 2008، والیوم 13، ص 265 ,(لانگ مین 455)

☆۱۔ ارسطو شمالی یونان کی ریاست مقدونیہ کے ساحلی علاقے میگنر میں ۳۸۴ ق م میں پیدا ہوا تھا اس کا والد ایک طبیب تھا اس نے ارسطو کی تعلیم کا خاص اہتمام کیا اور اس کو سترہ سال کی عمر میں افلاطون کی مشہور اکادمی میں داخل کرایا وہ علم جراحی میں ارسطو کے جوہر کو آزمانا چاہتا تھا۔ افلاطون نے ارسطو کو اپنے خاص شاگردوں میں شامل کر لیا۔ افلاطون کی وفات کے وقت ارسطو کی عمر ۳۷ سال کے قریب تھی ارسطو کو طبیعات علم ہیت، طب، ریاضی اور حیاتیات پر مکمل دسترس حاصل تھی وہ ادبی لحاظ سے شاعرانہ افکار کا شوقین تھا اس کی قابلیت کی شہرت جب مقدونیہ پہنچی تو بادشاہ فلپ نے ارسطو کو اپنے بیٹے کے لئے اتالیق مقرر کیا۔ ارسطو نے ایتھنز میں ایک ذاتی مدرسہ قائم کیا اور اس کا نام جولائی سیم رکھا۔ ارسطو نے اپنی اہم تصانیف منطق وخطابت، ادبیات، جمالیات مابعد الطبیعات اور اخلاقیات چھوڑیں اور ایتھنز میں ہی اس کی وفات ہوئی۔